M.A.URDU/SEM-2, CC-VI/ BY DR. TAUQEER ALAM

اردو نظم کا ارتقا

اردو نظم کے آغاز وابتدا کے تعلق سے ایک عام خیال یہ ہے کہ اس کا وجود کم وبیش اسی عہد سے ہوا جس عہد میں اردو شاعری معرض وجود میں آئی۔ اس خیال کے مطابق دکن میں اردو شاعری نے ارتقا کی پہلی منزل طے کی۔ یہ بات سچ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں جس عہد سے شاعری کا پتہ ملتا ہے اسی دور سے نظم نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ یہ نمونے مختصر مثنویوں کی صورت میں ہیں۔ ان کی نوعیت مذہبی اور صوفیانہ ہے۔ ۱۷ویں صدی کی ابتدا میں ان نظموں کی شکل بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ شمالی ہندستان میں صوفی شرف الدین یحی منیری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی وغیرہ ایسے بزرگوں میں خصوصی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں جنہوں نے صوفیانہ اور مذہبی مثنویاں لکھی ہیں۔ دوسری طرف دکن اور گجرات کے صوفی شعرا کے یہاں مذہبی اور صوفیانہ مثنویاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لیکن گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ کے یہاں خالص نظمیں پائی جاتی ہیں۔ ان نظموں میں خصوصیت کے ساتھ عید، شب برات، بسنت، رسوم شادی، معشوقوں کے حسن وکمال کا بیان، تعمیرات اور خود قلی قطب شاہ کی فتوحات جیسے موضوعات کو نظم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے یہاں پائی جانے والی نظموں کو نقش اولین تصور کریں تو گویا پہلا نظم نگار بھی قلی قطب شاہ ہی ہے۔ کیونکہ یہ ۱۶ویں صدی عیسوی کے قریب کا زمانہ ہے۔ قلی قطب شاہ کی نظموں میں انفرادی ذوق اور ذاتی تجربہ پایا جاتا ہے۔ اور ان میں ولولۂ حیات بھی ہے۔ قطب شاہ کا کلیات اس عہد کی نظم نگاری کو سمجھنے میں معاون ہے۔ اور نظم نگاری کی تاریخ مرتب کرنے میں اس کلیات کی اہمیت مسلم ہے۔ قلی قطب شاہ کی نظم ''جلوے کا گیت'' سے دو چار اشعار دیکھیں ؎

پریم پیاری کا جلوہ گاؤ سارے
اسے چندر سور سے پریاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھل مستک کھلے ہیں
سہلیاں آرتی تارے نوارے
رچاؤ تخت جادہ کا خوشی ہے
کہ چوندھر چوک موتیوں سے سنہارے
چڑاؤ تیل اب ساتوں سہاگاں
مشاطہ ہوکے زہرہ بت نگارے
پلاشربت دیو دہاتھاں میں بیڑے
بندھاؤ ساڑیاں، موتیاں کنارے
محمد قطب شہ اور اس پری کوں
خدا یا رکھ جلالی لگ ہیں ستارے

اس عہد میں دکن اور گجرات میں جو مثنویاں لکھی جارہی تھیں ان میں بعض مقامات پر نظم کا انداز اور رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان حصوں کو اگر مثنویوں سے الگ کردیا جائے تو وہ باضابطہ نظم کی ہیئت میں نظر آئیں گے۔ اس کے علاوہ اردو شعروادب میں واقعات کربلا کو باندھنے کا ایک عام رجحان رہا ہے۔ یہ عمل اردو شاعری کی ابتدا سے ہی جاری ہے۔ اس موضوع پر لکھی گئیں نظمیں صنف مرثیہ کے تحت آتی ہیں اور ان میں ایک مخصوص فضا پائی جاتی ہے۔ اس

لئے اسے مرثیہ ہی کہا جائے گا۔نظم سے اپنی مراد اوپر مذکور ہوئی۔ ہماری گفتگو اسی مفہوم کے دائرے میں ہوگی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جیسا کہ عرض کیا گیا، حالی اور آزاد کے ذریعے جدید نظم نگاری کی بنیاد رکھے جانے سے قبل حقیقت یہی ہے کہ شمالی ہند میں اردو میں باضابطہ نظم نگاری کی روایت نہیں ملتی۔ البتہ چیدہ چیدہ نمونے ملتے ہیں۔ جیسے اٹھارہویں صدی کے ربع اول میں یا اس سے پہلے سترہویں صدی میں اس کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اسی عہد کا ایک شاعر محمد افضل جھنجھانوی ہے۔ جس نے بارہ ماسے کہے ہیں۔ بارہ ماسہ کو بکٹ کہانی یا فارسی میں دوازدہ ماہہ بھی کہا جاتا ہے۔ بارہ ماسہ میں ایک عورت اپنے محبوب کی جدائی کا ذکر اپنی سہیلیوں سے کرتی ہے۔ ایسے موضوعات پر لکھی گئیں نظموں کو گیت بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن محمود شیرانی نے اسے نظم کہا ہے۔ شیرانی کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''محمد افضل کی بکٹ کہانی درحقیقت ایک بارہ ماسہ یا دوازدہ ماہہ ہے جس میں ایک فراق زدہ عورت اپنے خاوند کی جدائی میں اپنی سکھیوں اور سہیلیوں سے خطاب کر کے اپنی بے تابی اور درد جدائی کا الم سناتی ہے اور جیسا کہ ہمارے ملک میں دستور ہے ہر ہندی ماہ کے عنوان کے ذیل میں اپنا قصہ غم ایک دل گداز پیرایہ میں دہراتی ہے۔ اس کی زبان دکنی سے بہت مختلف ہے اور صاف ہے۔ اس نظم میں فارسی بندشیں جا بجا باندھی گئی ہیں ..... فارسیت کے باوجود یہ نظم جذبات کے لحاظ سے بالکل ہندی ہے۔ اس میں ہندوانہ زندگی کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ ..... شاید یہی وجہ ہے کہ محمد افضل کی یہ نظم ہندوؤں میں جیسا میر حسن کا بیان ہے، زیادہ مقبول رہی۔''

محولہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ محمد افضل کی یہ ''بکٹ کہانی'' یا ''بارہ ماسہ'' دراصل نظم ہے۔ حالانکہ یہ نظم مثنوی کی بحر میں ہے تاہم مثنوی سے بہت مختلف ہے۔ اس بارہ ماسہ سے چند اشعار دیکھیں ؎

سنوں سکھیو بکٹ میری کہانی
پھٹی ہوں عشق کے غم سوں نمائی
نہ مجھ کو سوکھ دن نہ نیند راتا
برہوں کی آگ میں سینہ جراتا
تمامی لوگ مجھ بَوری کہیں ری
خرد گم کردہ و مجنوں کہیں سی
نہیں اس درد کا دارو کسی کن
پھٹے حیراں سبھی حکمائے ذوخن
اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا
سیاناں دیکھ اس کوں دور بھاگا

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں ولیؔ کے دہلی آنے سے قبل شمالی ہند میں افضل جھنجھانوی کے علاوہ شیخ بہاء الدین اور جعفر زٹلی شاعری کر رہے تھے۔ جعفر زٹلی اپنی یاوہ گوئی کے سبب قابل توجہ نہیں سمجھے گئے۔ جیسا کہ ان کا نام ''زٹلی'' یعنی بکواسی یا یاوہ گو سے ہی ظاہر ہوتا ہے، انہوں نے اپنی شاعری میں فحش نگاری کو راہ دی مگر اس کے علاوہ بھی ان کے یہاں اور بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری سے جہاں ان کے قادرالکلام ہونے کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کی شاعری میں تنوع بھی ہے، زندگی کے گوناگوں مسائل بھی پائے جاتے ہیں، انہوں نے دہلی کی تباہی دیکھی تھی اس کا ذکر ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کا زمانہ اورنگ زیب کے آخری دور اور بہادر شاہ اول کا زمانہ ہے۔ ان کی شاعری میں فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس عہد کی اردو زبان کا رنگ روپ نمایاں ہے۔ ذیل میں ان کی نظم ''نوکری'' سے چند اشعار دیکھیں جس سے ان کی شاعری کا رنگ واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے ؎

بشنو بیان نوکری، جب گانٹھ ہووے کھوکھری
تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کاحظّ ہے

ہر صبح ڈھونڈے چاکری، کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھونڈیں لاگ ری یہ نوکری کا حظّ ہے
دس بیس مجرے میں گئے، دس بیس بخشی نے لئے
دس بیس جھگڑے میں گئے، یہ نوکری کا حظ ہے
رکھیں سپاہی گھا ت کو، چوکی دلادیں رات کو
کوئی نہ پوچھے بات کو، یہ نوکری کاحظ ہے
امراؤ سب ہیں بے خبر، احدی بچارے بے وقر
اسوار پاجی سے بتر، یہ نوکری کاحظ ہے
صاحب عجب بیداد ہے، محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے ، یہ نوکری کاحظ ہے

نظم نگاری کا یہ ابتدائی دور تھا۔شمالی ہند میں اردو شاعری دراصل فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانے میں شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شعرا نے فارسی شاعری سے منھ موڑ کر اردو شاعری کی طرف توجہ کی۔امیر خسرو، افضل جھنجھانوی اور جعفر زٹلی کے ذریعہ قائم کردہ راہ پر چل کر اردو شاعری کو حیات بخشی۔ نواب صدرالدین محمد خان فائز دہلوی اور شاہ ظہور الدین حاتم وغیرہ اس عہد کے نمایاں شاعر ہیں۔ان دو شعرا پر بالترتیب سید مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے وقیع کام کیا جس سے ان کی خصوصیات نمایاں ہوسکیں۔مسعود حسن رضوی ادیب نے دیوان فائز تحقیق کے بعد مرتب کیا جبکہ محی الدین قادری زور نے ''سرگزشت حاتم'' میں حاتم سے متعلق معلومات جمع کردی ہیں۔ان کتابوں میں ان کی نظم نگاری کے متعلق بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔فائز کی نظم نگاری کے تعلق سے مسعود حسن رضوی ادیب کہتے ہیں:

''فائز کے یہاں مسلسل نظمیں بھی ہیں اور مقدار میں غزلوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ان کے عنوان مختلف ہیں مثلاً تعریف پنگھٹ، وصف بھنگیٹرن، تعریف جوگن، بیان میلۂ بہتہ، تعریف نہان نگمبود..... یہ مسلسل نظمیں ثابت کرتی ہیں کہ جس طرح فائز ہماری موجودہ معلومات کی بنا پر دہلی کے پہلے اردو غزل گو قرار پاتے ہیں اسی طرح وہ دہلی کے پہلے اردو نظم گو بھی ٹھہرتے ہیں۔''

اسی طرح ''سرگزشت حاتم'' میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے حاتم کی شاعری پر کلام کرتے ہوئے انہیں دہلی کا پہلا اردو شاعر تسلیم کیا ہے۔حاتم کی نظم گوئی سے متعلق وہ کہتے ہیں:

''حاتم کو ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے بھی اہمیت حاصل ہے میر وسودا سے قبل شمالی ہند کے جس شاعر کے کلام میں مسلسل نظموں کے وافر نمونے ملتے ہیں وہ حاتم ہی ہیں۔ان کے ہم عصروں میں ناجی اور آبرو نے بھی مسلسل نظمیں لکھیں لیکن ان کے موضوع اتنے وسیع نہیں تھے اور نہ ان کی نظمیں اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں.....شاہ حاتم کی جو نظمیں خاص کر قابل ذکر ہیں ان کے نام یہ ہیں: حمد و نعت، حقہ، قہوہ، نیرنگی زمانہ، عرضی استعفاء، بنام فاخر خان، بارہویں صدی، حال دل''

یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ شاہ حاتم اردو کے پہلے شاعر ہیں یا نہیں۔البتہ اردو کے ابتدائی نظم نگار شعرا میں ان کا نام اہم ہے۔ان کی نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے باضابطہ طور پر نظم نگاری کی طرف توجہ دی ہے اور اس میں تجربے بھی کئے ہیں۔انہوں نے مخمس بھی کہا ہے۔ان کی نظموں کا انداز مثنوی سے مختلف ہے۔موضوعات کی سطح پر حاتم کے یہاں دیگر مضامین کے علاوہ فلسفیانہ اور مفکرانہ موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔جبکہ فائز کے یہاں زیادہ مثنوی کی ہیئت ہی پائی جاتی ہے۔حاتم کی نظم ''مخمس'' سے ایک بند ملاحظہ فرمائیں۔یہ نظم بارہویں صدی کے پریشانیٔ حالات پر ہے۔:

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی میں　　امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی میں
بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی میں　　تواضع کھانے کو دیکھو تو جگ میں پانی میں
گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

فائزؔ نگمبو دگھاٹ پر نہانے کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں:

ندی پر نمایاں ہیں سیمیں بدن
جیوں روپے کی تھالی میں ڈھلتے رتن
کھڑے گھاٹ پر ہیں بسی سیم بر
خجل ان کے سکھ سے سورج اور چندر
مرے دل کو آتا ہے اس سے حذر
کہ ان کو نہ لاگے سورج کی نظر
ہے اندر کی مانو سبھا جلوہ گر
کہ ہر نار دستی ہے رمبھا سوں ور
ہراک نار سورج سی موبھادھرے
کھڑی ہو سورج کی تپسیا کرے

ان اشعار سے حاتمؔ اور فائزؔ کی سوچ کا فرق بھی واضح ہو رہا ہے اور یہ فرق دونوں کے منصب، جاہ وحشمت اور معیار زندگی کا فرق ہے۔ فائز ایک منصب دار اور امیر شخص تھے۔ جبکہ حاتم ایک معمولی سپاہی اور درویش صفت انسان تھے۔ زندگی سے متعلق دونوں کے تجربے جدا جدا تھے۔

ان شعرا کے بعد نظم نگاری کو میر اور سودا نے جلا بخشی۔ لیکن ان کے ذکر سے پہلے ایک دو شعرا کا ذکر بھی ضروری ہے جنہوں نے نظم نگاری کی طرف باضابطہ توجہ تو نہیں دی مگر ایک آدھ نظم لکھی یا ان کی مثنویوں میں نظم کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں۔ یہ ہیں آبروؔ اور شاکر ناجیؔ۔ شاکر ناجی کی صرف ایک نظم ملتی ہے جو انہوں نے نادر شاہ کے حملے سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ آبرو نے ایک نظم ''موعظت آرائش معشوق'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اگرچہ اس پر مثنوی کا رنگ غالب ہے۔ تاہم یہ نظم اٹھارہویں صدی کی دہلی کی اخلاقی بے راہ روی اور جنسی پستی کی عکاس ہے۔

میرؔ اور سودا یوں تو غزل اور قصیدہ کے شاعر تھے اور اردو شعر و ادب کی تاریخ میں انہیں نظم نگار تسلیم بھی نہیں کیا جاتا لیکن ان کی بعض تخلیقات نظم کے زمرے میں رکھی جا سکتی ہیں مخمس، شہر آشوب یا ہجو وغیرہ جن میں زندگی اور مسائل زندگی پائے جاتے ہیں۔ ان نظموں میں انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی، داخلی اور خارجی اضطراب و کیفیات اور سماجی وفلسفیانہ مسائل بھی پائے جاتے ہیں۔ ان نظموں میں وحدت تاثر بھی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں میر نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل کے علاوہ قصیدے، مثنوی، شہر آشوب، ترکیب بند، مخمس اور مسدس وغیرہ لکھے ہیں۔ میر نے سوانحی نظمیں بھی لکھی ہیں جن سے ہمیں اس عہد کے سیاسی، سماجی اور اخلاقی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ میر کے عہد میں ہندستان کی سیاسی صورت حال انتہائی ابتر تھی بلکہ یوں کہیں کہ اورنگ زیب کی موت کے بعد مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی انگریزوں کا تسلط بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندستانی ذلیل وخوار ہو رہے تھے۔ لوگوں میں خود غرضی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایسے میں میر نے جو سوانحی نظمیں لکھی ہیں ان سے اس عہد کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن میر نے کوئی فنی تجربہ نہیں کیا۔ وجہ یہ بھی ہے کہ اس عہد میں بھی نظم نگاری کو علیحدہ کوئی صنف تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کلاسیکی دور تھا۔ جس میں روایات کی پاسداری دل وجان سے کی جا رہی تھی۔

اسی عہد میں اردو کے معروف شاعر اور میرؔ کے ہم عصر سودا بھی تھے۔ سودا نے نظم نگاری کے نام پر تو کچھ نہیں لکھا لیکن ان کی ہجو یہ شاعری میں نظم کی بھرپور خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ موسم گرما، موسم سرما، مخمس، شہر آشوب، چھڑی یا لاٹھی، قصیدہ اور تضحیک روزگار جیسی نظمیں پڑھئے گا تو فنی طور سے بھرپور نظموں کا لطف اٹھائیے گا۔ یہی نہیں اسے بہترین نظموں میں شمار کرنا ہوگا۔ شہر آشوب اور تضحیک روزگار وغیرہ نظمیں بظاہر ہجو ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عہد میں نظم نگاری کی کوئی مخصوص صنف موجود نہیں ہونے کے باوجود انہیں عمدہ نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں نگاری کی تمام فنی خوبیاں اور خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مثلاً تضحیک روزگار کو لیں۔ اس نظم کا لاغر گھوڑا زوال آمادہ مغلیہ سلطنت کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں وحدت تاثر بھی ہے اور نظم بڑی ترتیب اور فنکارانہ حسن کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے۔

اسی صدی یعنی اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جو میر اور سودا کا آخری دور تھا، نظیر اکبر آبادی نئے رنگ ڈھنگ سے شاعری کرتے ہوئے نظر

آتے ہیں۔انہوں نے غزل گوئی کی طرف کم توجہ دی اور نظم نگاری کو خصوصیت کے ساتھ اپنایا۔ان کی نظمیں زندگی سے بھرپور ہیں۔اور بجا طور پر انہیں عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔نظیر نے روایت کو توڑا تھا۔ان کے عہد میں ان کی شاعری کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا لیکن بعد میں محققین اور ناقدین نے نظیر کے شاعرانہ حسن کو پرکھا اور اسے سجا سنوار کر پیش کیا۔جس سے نظیر کی شاعرانہ عظمت نمایاں ہوسکی۔نظیر اکبر آبادی نے ہر طرح کی نظمیں کہی ہیں۔جیسے موسم،تہوار،کھیل کود،تفریحات،تغیر زمانہ،بچپن، جوانی، بڑھاپا،افلاس،عشق، مذہب وغیرہ۔''آدمی نامہ''ان کی خصوصیت کی حامل نظم ہے۔نظیر اکبر آبادی نے اپنی شاعری کا مواد اپنے گرد وپیش سے اخذ کیا۔ان کے یہاں نظم نگاری باضابطہ ایک فن بن کر ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے،جس میں زندگی کی تمام خوبیاں سمٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔نظیر نے ہیئت میں نمایاں طور پر کوئی تجربہ تو نہیں کیا لیکن یہ ضرور ہے کہ مختلف بحروں میں نظمیں لکھیں۔ان کی زبان آسان، عام فہم اور شستہ ہے۔ بلکہ انہوں نے عوامی زبان میں شاعری کی ہے۔نظیر نے مفلسی،تل کے لڈو،مہابیر کے میلے،کنہیا جی کا جنم، برسات، ہولی، جوانی، موت، جاڑے،امس،آگرہ کی تباہی، روضہ تاج گنج وغیرہ جیسی نظمیں لکھ کر شاعری کو ایک الگ ہی سمت عطا کر دیا۔اس طرح کی نظمیں ان کے عہد میں کسی نے نہیں لکھی۔اور اسی لئے اردو شاعری کا وہ ایک درخشاں ستارہ نظر آتے ہیں۔

گویا نظیر نے نظم نگاری کی بنیاد رکھ دی تھی لیکن نظیر کے انتقال کے بعد ایک دور ختم ہوگیا اس جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔یہاں تک کہ ایک نئے دور کی شروعات ہوئی۔ یہ انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ ہندستان پر انگریزوں کی حکومت مستحکم ہوچکی تھی۔۱۸۵۷ کی جنگ کے بعد ملک اور سماج میں ایک نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔اور حالات کچھ ایسے بن گئے تھے کہ غزل کی جگہ نظم کے لئے ماحول سازگار ہو رہا تھا۔اس عہد کے تقاضوں نے ناول اور افسانہ نویسی اور مضمون نگاری کو جلا بخشی۔نظم کی بنیاد رکھی گئی۔اور دیکھتے ہی دیکھتے نظم نگاری ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔کرنل ہالرائڈ کے ایما پر مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔کچھ محققین کے مطابق یہ ۱۸۷۶ کا زمانہ تھا۔تاہم اس میں اختلاف رہا ہے کہ اصل تاریخ کیا ہے۔ البتہ ۱۸۶۷ میں مولانا آزاد نے ''نظم اور کلام موزوں'' کے تحت اس سلسلے میں اپنے ایک خطبے میں اظہار خیال کر دیا تھا۔گویا جدید نظم یا باضابطہ نظم نگاری کی بنیاد انیسویں صدی کے نصف آخر یا ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد پڑی۔اور یہ بنیاد اس قدر مستحکم تھی کہ اس پر نظم نگاری کی ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔۱۸۷۵ میں انگریزوں کے خلاف فوج کی بغاوت اور ہندستانیوں کی مسلح نبرد آزمائی میں شکست نے انگریزوں کے ظلم و استبداد کا ہاتھ مزید دراز کر دیا۔جگہ جگہ سولیاں لٹکائی گئیں، بے دریغ پھانسیاں دی گئیں۔گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔مغلیہ حکومت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر جس نے انگریزوں کے خلاف ہندستانیوں کی قیادت کی تھی،اس ظلم و استبداد کا براہ راست شکار بنا۔اس کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا۔اور بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ گویا دہلی ایک بار پھر پوری طرح تباہ و برباد ہوئی۔اور اس تباہی سے بچے کھچے لوگ جائے اماں کی تلاش میں ادھر ادھر نکل کھڑے ہوئے۔اسی افراتفری کے عالم میں الطاف حسین حالی، مولوی سید احمد، مولوی کریم الدین، پیارے لال، منشی درگا پرساد نادر، اور پنڈت من پھول وغیرہ نے لاہور کا رخ کیا۔یہ وہ دور تھا جب غزل پر ابتری کی حالت تھی۔اس دور میں دہلی اور لکھنؤ میں جس نوعیت کی غزل گوئی کی جا رہی تھی، شاہی محفلیں اٹھنے کے بعد اس نوعیت کی شاعری پر بھی گویا زوال آگیا۔وجہ یہ تھی کہ ایک نئے نظام اور نئے حالات کے تحت غزل گوئی معیوب سمجھی جانے لگی۔شعرا کے سامنے دیگر زبانوں کی شاعری بھی آچکی تھی۔انہوں نے اس کا موازنہ اپنی شاعری سے کر کے، اردو شاعری کو اس کا ہم پلہ بنانے کیلئے کوششیں تیز کیں۔ایسی ہی صورت حال میں نیچرل شاعری کی بنیاد پڑی۔بعضوں کے نزدیک یہ غزل پر براہ راست حملہ تھا۔بہرکیف نظم نگاری کو فروغ دینے کے مقصد سے مئی ۱۹۱۴ء میں انجمن پنجاب نے نظمیں لکھنے کے ایک مصرع طرح دیا۔اور شعرا سے اس مشاعرے میں شرکت کی درخواست کی گئی۔مولانا حالی بھی اس تحریک کے اولین سالاروں میں تھے۔ انہوں نے نشاط امید، برکھارت، حب وطن اور مناظرہ رحم وانصاف جیسی مثنویاں انجمن پنجاب کے انہی مشاعروں میں پڑھیں۔

انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نظم کے پہلے مشاعرے میں مولانا محمد حسین آزاد نے ایک نظم پڑھی۔اور ''زمستاں'' کے موضوع پر نظم نگاری کے لئے طرح دی گئی۔اس مشاعرے میں بہت سے انگریز اردو داں بھی شریک ہوئے تھے۔انجمن کے زیر اہتمام ۳۰/جون ۱۸۷۴ء کو نظم پر پہلا باضابطہ طرحی مشاعرہ ہوا۔کوہ نور، لاہور کے ۱۶/مئی ۱۸۷۷ء کے شمارے میں ایک ضمیمہ شائع ہوا ہے جس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس مشاعرے میں مولانا آزاد،، مولوی عطاء اللہ، مولوی علاء الدین محمد کاشمیری، ولی شاگرد غالب، مولوی محمد مقرب علی، مولوی قادر بخش، مرزا اشرف بیگ، اشرف رئیس، منشی الٰہی بخش رفیق اور شاہ انور حسین ہما جیسے شعرا نے شرکت کی۔اردو ادب کی تاریخ میں یہ مذکورہ بالا شعرا مقبول اور معروف نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی بڑی شاعری کی

ہے لیکن ان کی حیثیت تاریخی ہے۔ کیونکہ انہوں نے نظم نگاری کو رواج وفروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی نظموں میں اس عہد میں بدلتی ہوئی زندگی کا عکس اور ساتھ ہی تعمیر نو کی خواہش بھی نظر آتی ہے۔ یہ شعرا اپنے حالات کے عہد سے ناامید نہیں تھے۔ بلکہ رجائیت پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں امید کی کرن پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور وہ مستقبل کو روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔ ''کوہ نور'' کے ضمیمہ میں مولانا آزاد کی نظم کے بارے میں لکھا ہے کہ ''آزاد مرحوم اپنی نظم کے لئے بحر کے انتخاب میں فرد تھے۔ ان کا یہ خصوصی امتیاز ہے کہ وہ لیٹی ہوئی اور سست بحروں میں کبھی قلم نہ اٹھاتے تھے اور نظموں کی طرح ان کی یہ نظم بھی رواں دواں اور شاندار ہے۔ قوت تاصیف اور حسن ادا، جدت تخیل اور اسلوب کی ندرت ان پر ختم ہے۔''

انجمن پنجاب نے نظم نگاری کی جو بنیاد ڈالی اس نے آئندہ چل کر ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ نظم نگاری نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی نظم نگاری پر جلسے منعقد ہونے لگے۔ لیکن ہم یہ بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ نظم نگاری کی اس تحریک کی مخالفت بھی ہوئی۔ خصوصاً دہلی اور لکھنو میں اس کے خلاف ایک طوفان اٹھا۔ اس کے علاوہ رام پور اور حیدر آباد جیسے ادبی مراکز میں بھی نظم نگاری کو حمایت نہیں ملی۔ ان مراکز میں روایتی شاعری کچھ اس طرح جڑ پکڑ چکی تھی کہ نظم نگاری کی تحریک اس کے آگے بے اثر ثابت ہوتی ہوئی نظر آئی۔ لیکن یہ عہد تاریخ کے دامن میں نظم نگاری کے دور سے موسوم ہوا۔ کیونکہ نظم کی تحریک میں بڑی قوت تھی۔ غزل کے لئے اس عہد کے حالات سازگار بھی نہ تھے۔ اس لئے نظم نگاری کو اپنے پھلنے پھولنے کا موقع زیادہ راس آیا۔ اور نظم نے غزل گوئی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنی شناخت قائم کی۔

اس تحریک کے زیر اثر کی گئی شاعری نیچرل شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ مولانا آزاد اور مولانا حالی یہی چاہتے تھے کہ شاعری نیچرل ہو۔ چونکہ اس وقت کے حالات کچھ ایسے تھے جو نیچرل شاعری کے لیے تقاضا کر رہے تھے۔ اور یہی وجہ رہی کہ اس عہد میں نظم نگاری کو خاطر خواہ فروغ ملا۔ گویا شاعری کا ایک نیا فارم، ایک نئی ہیئت اور ایک نیا رنگ و انداز سامنے آیا۔ خیالات بھی بدلے، ہیئت میں بھی تبدیلیاں ہوئیں اور شاعری زندگی سے قریب تر ہوگئی۔ یہ تحریک اتنی توانا تھی کہ ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا ذکاء اللہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اگرچہ یہ شاعر نہیں تھے لیکن انہوں نے اس کی افادیت کو پہچانا اور اس کی حمایت کی۔

نظم نگاری کی آبیاری کرنے میں مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، علامہ اقبال، چکبست، شوق قدوائی، پنڈت کیفی، صفی لکھنوی، سرور جہان آبادی، نادر کاکوروی اور ظفر علی خاں نے خون جگر صرف کیا۔ اور اس کثرت سے ساتھ نظمیں کہیں کہ یہ صنف لازوال ہوگئی۔ ان شعرا نے زندگی کے تقریباً تمام تر پہلوؤں کو اپنی نظم نگاری میں سمیٹ دیا۔ حتی کہ جنگ آزادی میں اس صنف کو بعض شعرا نے ''ہتھیار'' بنا کر پیش کیا۔ اور خفتہ قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا۔ حب الوطنی میں متعدد نظمیں کہیں گئیں۔ اقبال نے تو اپنے نظریے اور فلسفے کی توضیح کے لئے اس صنف کا انتخاب کیا اور کئی مشہور و شاہکار نظمیں تخلیق کیں۔ دوسری طرف اسمٰعیل میرٹھی نے زندگی سے وابستہ اور خصوصاً بچوں کیلئے جو نظمیں کہیں ان کی چمک آج بھی برقرار ہے۔ نظم نگاری صرف یہی نہیں کہ ایک صنف کی صورت میں ابھری بلکہ اس نے موضوعات کے دائرے کو وسیع بھی کیا، خیالات میں تنوع پیدا کیا اور سوچنے کا ڈھنگ بدل ڈالا۔ ان شعرا نے قدیم و جدید کے امتزاج سے بھی کام لیا جس سے رنگا رنگی پیدا ہوگئی۔ نظم نگاری نے بدلتے ہوئے حالات کا سامنا کیا۔ وہ ماضی کی لکیروں کو پیٹتی نہیں رہی بلکہ نئے زمانے اور نئے مزاج سے ہم آہنگ ہو کر زندگی کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پرانی قدریں مٹ رہیں اور ان کی جگہ پر نئی قدریں جنم لے رہی تھیں۔ ان شعرا نے جہاں ماضی کا مرثیہ لکھا وہیں حال میں رونما ہونے والی تبدیلی کا خیر مقدم بھی کیا۔ مستقبل کی امیدوں کو روشن کیا۔ عالمی اور بین الاقوامی حالات پر بھی ان کی نظر تھی لہٰذا عالمگیر سوجھ بوجھ کا بھی مظاہرہ کیا مگر ان کا نظریہ سیاسی نہ تھا۔ انجمن پنجاب کے تحت شروع ہوئی تحریک کے زیر اثر جو شاعری ہو رہی تھی اس کا مقصد نیچرل اور اخلاقی شاعری کرنا تھا۔ اسلئے شعرا نے اخلاقیات کو ملحوظ نظر رکھا اور نظم کے حسن کو بھی مجروح نہ ہونے دیا۔ لیکن اس کے بطن میں رومانیت بھی پرورش پا رہی تھی۔ اور آگے چل کر شعرا نے رومانی نظم نگاری کی طرف توجہ کی۔ اور چاندنی، برسات، دریا، پہاڑ، جانور، چڑیا، رسم و رواج وغیرہ پر نظمیں لکھی گئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مغربی ادب کے اثرات نمایاں طور پر مشرقی ادب پر مرتب ہو رہے تھے۔ اور اسلوب و انداز کی سطح پر مغرب کی تقلید کی جا رہی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہیئت کی سطح پر تجربے نہیں کئے جا رہے تھے۔ اسی دوران پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس جنگ نے مغرب و مشرق کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اس کے اثرات شاعری پر بھی پڑے۔ قوم پرستی بیدار ہوئی، آزادی کا احساس شدید ہوا۔ ساتھ ہی مساوات اور ترقی کی جدوجہد بھی شروع ہوئی۔ عالمی سطح پر بڑی سیاسی تبدیلی کی بدولت ہندستان میں بھی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ اور ان تمام تر صورتحال کا عکس

ہماری شاعری میں نظر آتا ہے۔

گویا اس عہد میں موضوع اور ہیئت، فکر اور فن دونوں نے جلا پائی۔ موضوعاتی سطح پر قومی، سیاسی، وطنی اور ملکی حالات و معاملات کو شاعری میں جگہ دی گئی۔ باتیں اخلاقیات کی بھی ہو رہی تھیں لیکن ہندستان اس وقت آزادی کی لڑائیاں لڑ رہا تھا۔ بھلا شعرا اس سے کیسے بیگانہ رہ سکتے تھے۔ کیونکہ ہر فنکار جہاں اپنے عہد اور ماحول کا پیداوار ہوتا ہے وہیں اپنے ماحول ہی سے مواد اخذ کرتا ہے۔ لہٰذا ان شعرا نے ہندستان کی سیاسی صورت حال سے متاثر ہو کر سیاسی نظمیں بھی کہیں۔ شعرا میں سیاسی شعور ملکی حالات کے پیش نظر پیدا ہوا۔ ظاہر سی بات ہے یہ چیزیں تخیل سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ آدمی جن حالات میں جی رہا ہوتا ہے ان حالات سے کنارہ کش کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ حالات انسان کو اپنے ساتھ ڈھلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہندستان میں سیاسی بیداری آنے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی کی نئی صبح اور فضا میں سانس لینے کیلئے جہاں ہر ہندوستانی مچل رہا تھا وہیں شعرا نے غلامی زنجیروں کو توڑنے کیلئے قلم تلوار اور سپر بنا لیا تھا۔ اور یہ سب چیزیں نظم کی صورت میں سامنے آ رہی تھیں۔ اور صنف نظم کا دامن وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ نظم انسانی زندگی کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اور اس کے دو فائدے ہو رہے تھے۔ ایک طرف یہ صنف جلا پا رہی تھی اور دوسری طرف اس صنف سے کام لے کر شعرا قوم کی بیداری اور ملک کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

آزادی حاصل کرنے کے جذبے اور ذوق تجدد نے خیالات و تصورات کو مہمیز کیا۔ شعرا خیال آفرینی کے لئے مختلف سمتوں میں ذہنی سفر پر آمادہ ہوئے۔ یہاں تک کہ بے تکان آوارہ خرامی کی حد تک خیالوں کی دنیا میں گلگشت ہونے سے، بہت سے روایتی بند ٹوٹ گئے اور بہت سے نئے مراحل طے کئے گئے۔ شعرا کی اسی ذہنی آوارہ خرامی اور فکر و فن کی سطح پر نئی دنیا کی تلاش سے رومانیت وجود میں آئی۔ رومانیت اس عہد میں اس قدر توانا ہوئی کہ تمام شعرا کو اپنے حصار میں قید کر لیا۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جو رومانیت کے سحر کا شکار نہ ہوا ہو۔ رومانیت عشقیہ شاعری کا نام نہیں ہے بلکہ ہر موضوع کے انتخاب اور اظہار میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پہلی نظر میں عشقیہ جذبات کے اظہار میں یہ زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی، سماجی اور فکری رجحانات میں بھی اس کی کارفرمائی صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں جوش، اختر شیرانی، فراق، جمیل مظہری، حفیظ، اختر انصاری، ساغر، احسان دانش وغیرہ کے یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اس دور میں نظم کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا سماجی اور سیاسی صورت حال تھی۔ انسان اس قدر مسائل حیات اور زندگی کی پیچیدگی کا شکار تھا کہ نظم نے اس ناسور کے لئے مرہم کا کام کیا۔ جیسے ہی نظم نگاری کی تحریک شروع ہوئی شاعر اور قاری دونوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نظم میں مسائل زندگی کا احاطہ کرنے اور ہیئت میں تجربے کے وافر امکانات موجود تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہیئت میں عروض کے دائرے میں رہتے ہوئے بڑے پیمانے پر تجربے کئے گئے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے ان شعرا کو جنہوں نے نظم کی آبیاری کی، دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے نظم کو معنوی وسعت دی جبکہ دوسرے گروہ نے ہیئتی تجربے کئے۔ ان شعرا میں جنہوں نے نظم کو معنوی وسعت دی خصوصیت کے ساتھ اقبال، جوش، فراق، جمیل اور اختر شیرانی کا نام لیا جا سکتا ہے جبکہ ہیئتی تجربہ کرنے والے نظم نگار شعرا میں حفیظ جالندھری، ساغر، عظمت اللہ خاں اور افسر شامل ہیں۔

یہاں خصوصاً اقبال کا ذکر کیا جانا چاہئے انہوں نے منظری نظمیں کہنے کے علاوہ فلسفیانہ نظمیں بھی تواتر سے کہیں۔ ان کا ابتدائی دور مناظر فطرت کی عکاسی پر مبنی ہے۔ اس ضمن میں کا مجموعہ ''بانگ درا'' دیکھا جا سکتا ہے۔ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے مشرق و مغرب کے ادبیات کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنا نظریہ قائم کیا۔ ان کے غور و فکر ملتا ہے۔ جس سے ان کی شاعری جلا پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا تیور اور رنگ جدا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی متعدد نظموں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بانگ درا اور بال جبریل میں اس کی طرح کثرت سے ملیں گی۔ ان کی نظم ''شاہین'' سے ایک دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

نہ باد بہاری نہ گلچیں نہ بلبل — نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جوانمرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال زیادہ ابتر ہونے کے باعث پورے ملک میں کرب واضطراب کا دورودورہ سا ہو گیا تھا۔شعراوادبا بھی اس کرب واضطراب میں برابر کے شریک تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان کو آزادی دلا کر یہاں کے ماحول اورصورت حال کو سازگار کیا جائے۔یہی وجہ تھی کہ ان کی کوششوں سے نئی فضا پیدا کرنے کے لئے حالات میں تبدیلی آئی۔آزادی کی کوششیں تیز ہو چکی تھیں ہندوستان کا ہر فرد جان کی بازی لگا کر اس آزادی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ایسے میں شعرانے پرانی محفلیں ہونے کے ساتھ ساتھ نئی انجمنیں اور بزمیں سجانی شروع کیں۔اس طرح شعرانے کربناک زندگی کو راحت میں بدلنے کا کام کیا۔لوگوں کے اندر شعور پیدا ہو چلا تھا۔انہوں نے جس سمت راہ دیکھی ادھر چل پڑے۔اردونظم نگاری کا یہ وہ دور تھا جب ''جدیدیت'' کے نام پر بڑے تجربے کئے گئے۔ اسلوب اور ہیئت میں تبدیلی آئی۔ ابہام اور اشاریت کو بھی راہ ملی۔ یہ ''جدیدیت'' وہ جدیدیت نہ تھی جو بعد میں اردوادب میں ایک رجحان کی صورت میں تبدیل کی گئی بلکہ موجودہ صورت حال سے نجات پانے اور نئی دنیاؤں کو خلق کرنے کی سعی وکوشش نے ایک نئی تحریک کی صورت اختیار کی۔اسے ترقی پسند تحریک کے نام سے یاد کیا گیا۔جس نے ادب برائے ادب کے نظریے کو پس پشت ڈالتے ہوئے ادب برائے زندگی کے نظریے کو تقویت پہنچائی۔اس عہد کے شعراوادبا نے زندگی اور ادب کو ایک کر دیا۔اس سے زندگی کو سنوار نے میں جہاں مدد ملی وہیں نظم نگاری کو بھی قوت وتوانائی حاصل ہوئی۔اگرچہ ترقی پسند تحریک کے بعض نقائص بھی ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تحریک سے ادب کو بہت فائدہ بھی پہنچا۔اسی عہد میں نظم نگاری کو نئی پرواز ملی۔ترقی پسندی،زندگی سے اسی آشنائی کا نام ہے۔اس تحریک کی پیدائش مغرب میں ہوئی۔لیکن دیکھتے دیکھتے اس نے پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کر دئے۔اس کی بنیاد لندن میں سجادظہیر وغیرہ نے ڈالی۔ بعد ازاں سجادظہیر کی ہندوستان آمد کے بعد یہاں ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔جس میں پریم چند جیسے افسانہ نگار نے بھی شرکت کی اور ترقی پسند تحریک کو حمایت دی۔اس عہد کی نظم نگاری پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مارکس اور فرائڈ کے نظریات سے ہماری اردونظم نگاری بھی متاثر ہے۔یہ دونوں نظم نگار شاعر ہیں اور اردونظم کے ارتقا میں یہ اپنا مقام رکھتے ہیں۔تاہم فکری اور فنی روایات کے اعتبار سے دونوں متضاد ہیں۔لیکن اردونظم بیک وقت ان دونوں کے اثرات قبول کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردونظم میں فاشزم اور سوشلزم،حقیقت پسندی اور تصوریت ساتھ ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔اشاریت اور حقیقت نگاری میں بہت بُعد ہے لیکن اس دور میں اردو میں دونوں تحریکوں کی آبیاری کی جارہی تھی۔اس کے سبب ہماری نظم تھوڑی پیچیدہ نظر آتی ہے۔گڈمڈ کی یہ کیفیت اس لئے پیدا ہوئی کہ نظم نگاروں کی ایک جماعت نے جنس اور اس کے اسرار ورموز کی پردہ دری کو نظم گوئی کا مطمح نظر بنایا جبکہ ایک گروہ نے ہیئت کے تجربات کو اصل شاعری جانا۔آزادنظم اسی ہیئتی تجربے کے رجحان کی پیداوار ہے۔انہی بنیادوں پر نظم نے اپنا ایک وسیع میدان قائم کر لیا۔مثنوی،قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ کی چمک نظم کے آگے ماند پڑ گئی۔لیکن نظم نے وہ صورت اختیار کر لی جس میں مثنوی کے رنگ اور مرثیے کی دلسوزی بھی پائی جانے لگی۔مطلب یہ کہ نظم نے ان تمام موضوعات ومضامین کا احاطہ کیا جو انسانی زندگی اور سماج سے عبارت واخذ کردہ ہیں۔مثلاً اردونظم میں عشق ومحبت کے مضامین بھی پائے جاتے ہیں،امن وجنگ کی صورت کا ذکر بھی ہے،انسان دوستی اور انفرادیت کا رجحان بھی ہے اور عقیدت پرستی اور بغاوت کے پہلو بھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ فکرو فن میں ایک اندرونی ربط وتسلسل پایا جاتا ہے۔ہماری شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مارکسزم کے مشعل برداروں نے حقیقت نگاری کو راہ دی۔مقصدیت،تیقن،امیدوبیم،سماجی احساس وذمہ داری،آزادی اور انسان دوستی کا اپنی شاعری میں برملا اظہار کیا۔دوسری طرف فرائڈ کے نظریے کے حامل شعرانے ہیئتی تجربے،ابہام،انفرادیت،زندگی سے بے زاری ولاتعلقی،عام سماجی تصورات ومنہاج سے گریز، مایوسی اور بے یقینی کو اپنا شعار بنایا۔ان رجحانات کی پیروی کرنے والوں میں اردو کے بڑے بڑے شعرا کا نام ہے۔جیسے اول الذکر کے نظریے کے حامل شعرا میں جوش،فیض،مجاز،علی سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔جبکہ میراجی،ن۔م راشد،الطاف گوہر،مختار صدیقی اور سلام مچھلی شہری جیسے شعرا فرائڈ کے نظریے کے حامل نظر آتے ہیں۔لیکن اس اختلاف کے باوجود ان شعرا میں ایک قدر مشترک بھی ہے اور وہ ہے نظم کی فکری اور تعمیری نظام کی پاسداری۔یہ تمام شعرا اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ فکر وفن کا اشتراک ضروری ہے۔اور اسی کی بدولت اردوشاعری میں ہیئت پرستی کا رجحان کمزور ہوتا گیا۔اور ان شعرا کو ابدیت حاصل ہوئی جنھوں نے فکر کے ساتھ فن کو بھی ملحوظ نظر رکھا۔اور خون جگر جلا کر فن کی تشکیل وتنسیخ کی۔اپنی نظم نگاری میں فن کو بھی ایک قدر کی حیثیت دینے والے شعرا میں جوش،فراق،آزاد،فیض،جذبی،احمد ندیم قاسمی،مخدوم،جاں نثار اختر،قتیل شفائی،مجروح،اختر انصاری،تاباں،شمیم کرہانی،ظہیر کاشمیری، پرویز شاہدی،ساغر،ساحر،ملا،سرور،نیاز حیدر،راشد،الطاف گوہر،سلیمان ادیب،اختر الایمان،نریش کمار،شور،مختار صدیقی،شاذتمکنت،وحید اختر،خلیل

الرحمن، باقر مہدی، مسعود حسین خان، حمایت علی شاعر، ابن انشا، مخمور، راہی اور نازش وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد میں شعرا کی ایک بڑی جماعت نظم کو وسعت دینے اور اس کے حدود کو پھیلانے میں لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس عہد میں غزل ایک بار پھر اپنے بکھرے ہوئے رخت سفر کو سمیٹ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے تاہم نظم اپنے منصب اور دائرے میں نمایاں اور کامیاب ہی نظر آتی ہے۔

اقبال اور جوش نے اردو نظم نگاری میں جو راہ بنائی اسی پر چل کر جاں نثار اختر، روش اور مجاز وغیرہ نے اپنی نظم نگاری کی عمارت کھڑی کی۔ جدید دور میں یا آزادی کے بعد اردو نظم نگاری نے ایک نئی کروٹ لی۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ یعنی یوم آزادی ہندستان نہ صرف تاریخی اعتبار سے بہت اہم دن تھا بلکہ اس کے انسانی زندگی پر نہایت دوررس اثرات بھی مرتب ہوئے۔ چونکہ ہندستان کی آزادی کے بعد فوراً تقسیم ہند کا المیہ پیش آیا۔ جس نے ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے اثرات اردو نظم پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی طرح ۱۹۴۷ بھی اردو نظم کے لیے ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف تقی لکھتے ہیں:

''اردو نظم کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کو جو اہمیت حاصل ہے، کم وبیش ۱۹۴۷ء کی بھی وہی اہمیت ہے۔ ۱۹۴۷ء بھی ۱۸۵۷ء کی طرح ہماری سیاسی تبدیلی اور سماجی واقتصادی ابتری وانتشار کا ایک اہم باب ہے۔ ۱۸۵۷ء میں اگر ہماری سیاسی شکست اور اقتصادی وسماجی غلامی کی ابتدا ہوئی تھی تو ۱۹۴۷ء میں ہماری سیاسی فتح اور اقتصادی وسماجی آزادی کی پہلی کرن پھوٹی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے جس طرح زندگی کے تمام شعبے اور ادب متاثر ہوئے اور اردو نظم کے لئے ایک نئی راہ پیدا ہوئی تھی اسی طرح ۱۹۴۷ء کی آزادی بھی سماجی قدروں اور سیاسی نظریوں کو تبدیل کرنے کے علاوہ اردو ادب خصوصاً اردو نظم کو متاثر کرتی ہے.....

آزادی کے بعد خاص کر نظم گو شعرا نے جن کی اکثریت ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھی جن ہواؤں کو محسوس کیا اس کا پہلا جھونکا ''گرم ہوا'' کا تھا جن میں خون کی بو اور لاشوں کی سرانڈ بھی شامل تھی۔ اس لئے کہ آزادی اپنے دامن میں ملک کی تقسیم کی اتنی بڑی خلیج لے کر آئی تھی جسے پاٹنا ناممکن تھا۔''

یہی وجہ تھی کہ آزادی ملنے کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے انفراد اور انتشار کو جنم دیا۔ آزادی کی جدوجہد کرتے وقت شعرا نے جو خواب دیکھا تھا وہ یک بیک منتشر ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ بعض نے تو اسے آزادی تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ فیض احمد فیضؔ ان شعرا میں سرفہرست ہیں۔ ان کی نظم ''صبح آزادی'' ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد کہی تھی ؎

یہ داغ داغ اجلا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غم دل
جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں پر
چلے جو یار تو دامن پر کتنے ہاتھ پڑے
پکارتی رہیں بانہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ظلمت و نور

سنا ہے ہوبھی چکا ہے وصل منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاط وصل حلال و عذاب ہجر حرام
جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ ودل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض کی ایک نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تو قیر عالم تو قیر لکھتے ہیں:

''.....کشور ہندوستاں آزاد ہو چکا ہے۔ دوقومی نظریے کی بنا پر ملک کی تقسیم بھی ہو چکی ہے۔ تنگ نظری اور تعصب کے طفیل لاکھوں انسانوں کو بھینٹ چڑھا کر سرزمین ہند سرخ بھی کی جا چکی ہے۔ وہ سب کچھ ہو چکا ہے اور سب کچھ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کچھ شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا تو وہ ایک شاعر کا خواب ہے۔ وہ صبح ابھی تک نہیں آئی جس صبح کا خواب، جنگ آزادی کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے ایک شاعر نے دیکھا تھا۔.....''

دوسرے شعرا نے بھی اس المیے کو شدت سے محسوس کیا تھا جن میں میراجی، علی سردار جعفری، مخدوم اور جگن ناتھ آزاد خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شعرا کی نظموں سے بھی دو دو شعر دیکھتے چلیں ؎

خبر نہ تھی، بہار جس کی آرزو چمن کو ہے　　بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے
بہار جس کا اشتیاق سنبل وسمن کو ہے　　جب آئے گی تو موج زہرناک ساتھ لائے گی
خزاں کی طرح آئے گی چمن میں پھیل جائے گی

(جگن ناتھ آزاد)

کون آزاد ہوا کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لیے
مادر ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی

(علی سردار جعفری)

کھلونے بکھرے ہوئے پڑے ہیں
نہ اب وہ چہکار ہے، نہ ڈالی ہوا کے جھونکوں سے جھومتی ہے
نہ کوئی پیڑ چاہتا ہے- یہ شور، ہنگامہ ہائے ہو کا یونہی
مچلتا رہے ہمیشہ
یونہی ابلتا رہے ہمیشہ یہ شب کا سرچشمہ
مگر وہ چشم جو چند لمحوں میں ایک دریائے بیکراں بن کے
پھیلتے پھیلتے ہر ایک شے پر چھا گیا تھا
اب ایک گہرے سکون میں گم ہے

کھلونے بکھرے ہوئے پڑے ہیں۔

(میراجی)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوار غم بن گئے
خارزار الم بن گئے
رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا۔

(مخدومؔ)

اس موقع پر پرویز شاہدی کو بھلایا نہیں جاسکتا جنہوں نے اپنی نظم میں اس ''شب گزیدہ سحر'' کا ماتم کیا ہے اور گوروں کو اس المیے کا ملزم ٹھہرایا ہے۔

یہ خرد سال ''اجالا'' یہ تیرگی کا سپوت
یہ روسیاہیٔ شام بلا کا نور نظر
حریص رات کے دل کا یہ عکس نور فریب
ہوس کی ساحرۂ تیرہ رخ کا لخت جگر
یہ غازہ ساز فرنگی کا اک ثبوت کمال
یہ ''گورے تاج'' کی مشاطگی کا اوج ہنر
یہ ''کوہ نور'' کے چوروں کی اک نوازش خاص
سفید تخت کا یہ سحر بندگی گستر
یہ تاجرانہ سیاست کی نقرئی سازش
یہ خسروانہ شرارت کی صبح شب پرور
یہ برص فام قیادت کی فاتحانہ نمود
یہ داغدار سیاست کا رنگ تیغ و کمر
یہ خرد سالی کا دعویٰ یہ ناز معصومی
سفید بالوں کا سر پر لئے ہوئے لشکر
یہ سادہ روئی طفلی کا پے بہ پے اعلان

یہ جھریوں کی سیاست نقاب کے اندر
مسافران شب تار پہ یہ روشن ہے
کہ اور بھی انہیں کرنا ہے ظلمتوں میں سفر
مگر تصور مہر مبیں کو کیا کہیئے
کہ رات ہی سے درخشاں ہے خاک راہ گذار
ہے سطوت شب تاریک ریگ کی دیوار
ہوائے تند کے دامن میں پل رہی ہے سحر (پرویز شاہدی)

لیکن کچھ شعرا ایسے بھی تھے جو اس عظیم المیے کے باوجود اپنے آشیانے کے بکھرے تنکوں کو سمیٹ کر جشن آزادی منانا چاہتے تھے۔ اور اس بات کے لئے پر امید ہیں کہ اسی خارزار سے بوستاں تیار ہوگا۔ یہ ان کا مثبت رویہ اور رجائی نقطہ نظر ہے۔ ان شعرا میں جوشؔ پیش پیش ہیں۔ ان کے بعد مجاز اور جذبی اسی قبیل میں رکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی نظموں سے ایک دو بند ملاحظہ فرمائیں ؎

میاں یہ وقت جشن ہے مباحثے سے فائدہ
محل رقص ووجد ہے کہ راستہ تو پالیا
فضا سے ابر چھٹ گیا ہوا کا رخ بدل گیا
جو دل میں ہے حسینیت تو کیا بلا ہے کربلا
وہ گل بنے گا بوستاں جو آج خار زار ہے
بہار پر بہار ہے بہار پر بہار ہے

(جوشؔ)

ہراک جبیں پہ ہے اک موج نور آزادی
ہراک آنکھ میں کیف و سرور آزادی
غلامی خاک بسر ہے حصور آزادی
ہر ایک قصر ہے اک بام طور آزادی
ہر ایک بام پر اک چشم زر فشاں ہے

(مجازؔ)

ان نظموں میں جہاں فنی خوبیاں اپنے شباب پر ہیں وہیں اپنے عہد کے حالات کی بھرپور طور پر عکاسی کی گئی ہے۔ اس گام پر شعر از زندگی اور سماج سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ ان شعرا نے جہاں تقسیم ہند کے المیے کو صاف طور پر پیش کیا ہے وہیں اس کے نتیجے میں پھوٹنے والے ہندو مسلم فسادات کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔ دراصل یہ فسادات ملک گیر پیمانے پر ہوئے جس سے انسانی زندگی میں اتھل پتھل پیدا ہوگئی یا یوں کہیں کہ ایک عظیم انقلاب رونما ہوا تھا جس سے تہذیبی شکست وریخت بڑے پیمانے پر ہوئی۔ ان فسادات میں روایتی اقدار کو مٹا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض ناقدین اسے ایک ملک میں رہنے والے دو بھائیوں ہندو اور مسلم کے درمیان لڑائی نہیں بلکہ دو تہذیبوں کا تصادم تصور کرتے ہیں۔ یوسف تقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''یہ فرقہ وارانہ فساد جس کی ابتدا نواکھالی سے ہوئی تھی اور جو جنگل کی آگ کی طرح پورے غیر منقسم ہندستان میں پھیل گئی تھی دو بھائیوں کی معمولی جھڑپ نہیں تھی بلکہ یہ دو تہذیبوں، دو مذہب، دو کلچر اور دو نظریے کی معرکہ آرائی تھی جو ایک دوسرے کو نگل لینا چاہتے تھے۔ اس فساد میں جہاں مکانات جلائے گئے محلوں کو ویران کیا گیا گاؤں کے گاؤں برباد کئے گئے، انسانی جانوں کا بے دریغ خون کیا گیا وہاں تہذیب کا گلا بھی گھونٹا گیا۔ مذہب کی بنیاد بھی

ہلائی گئی، کلچر کو تباہ و برباد کیا گیا۔ نظریے بدلے گئے، اس کے ساتھ ساتھ دونوں فرقوں کی معاشیات کو بری طرح برباد کیا گیا اور گھریلو صنعت جسے کچھ تو انگریزوں نے اپنی تاجرانہ پالیسی کے مدنظر تباہ کیا اور کچھ فسادات کی نذر ہوئی۔''

اردو نظم نے اس کی بھرپور عکاسی کی ہے بلکہ یوں کہیں کہ اس المیے کا ماتم کیا ہے جس نے انسانیت، آپسی رواداری اور محبت واخوت کو جلا ڈالا۔ وامق جون پوری اپنی آزاد نظم میں اس صورت حال کا ماتم کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے احتجاج کرتے ہیں ؎

ہٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے
یوم آزادی کا یہ لمحہ جھکائے ہوئے سر
جس کی ہر سانس میں مدقوق تعفن لرزاں
دادخواہی کے لئے پھر سوئے مغرب ہے رواں
جل رہی ہے سر بازار چتا غیرت کی
موت اور زیست کے دوراہے پر پہرہ دینے
اہرمن اپنے جہنم سے نکل آیا ہے
آج پھر صاعقہ بردوش ہے ابلیس کی فوج
پڑ گئی تہلکہ امن وسکوں کی ہر موج
بھیڑیئے آدمی کے روپ میں گھس آئے ہیں
زہر پیوست ہوا جاتا ہے شریانوں میں
بربریت کے ہوس خانے ہوئے پھر آباد
پھر اٹھالے گیا سیتا کو کوئی راون آج
اب دروپدی کے جسد پر نہیں باقی کوئی تار
عصمت مریم وحوا کی حقیقت ہوئی خواب
ہٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے۔

(وامق جون پوری)

علی سردار جعفری جیسے ترقی پسند شاعر اس انسانی المیے پر بھلا کب خاموش رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے ؎

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ خواب ہے کس قدر پریشاں
ہزار سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں، سسکتی پلکیں
اندھیرے شب میں
کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈتی ہیں

(علی سردار جعفری)

اس عہد کے دوسرے شعرا نے بھی اس المیے کو بخوبی محسوس کیا اور اپنی نظموں میں اس کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے۔ ان میں چند ایک کے کلام سے ایک دو نمونے ملاحظہ فرمائیں ؎

نفرتیں بوئی گئیں
کھوٹ ڈالا کیا معصوم دلوں کے اندر
شک و شبہات کی دیوار اٹھائی گئی ہر سینے میں
روحیں بیدار ہوئیں
ہر طرف لاشوں کے پشتارے تھے
خون میں لتھڑے ہوئے جسم، بھٹکتی لاشیں
سر بریدہ مگر افلاک کی جانب نگراں
اور جو کچھ نہ ہوا تھا سو ہوا

(منیب الرحمن)

نہ جانے آخر
یہ پکڑو پکڑو
یہ مارو مارو کا شور کیسا
یہ ابر گرجا کہ چرخ ٹوٹا
یہ گریہ زاری، ہ بین، چیخیں
دھوئیں کے یہ ناچتے بگولے
یہ آگ کے بڑبڑاتے شعلے
یہ کیسا لاوا ابل پڑا ہے
لہو خلا میں اچھل رہا ہے
مجھے نہ مارو
یہ گھر تمہارا
یہ مال، زیور، یہ زر تمہارا
خدائے واحد کے شاہکارو
مجھے نہ مارو
ادھر تو دیکھو
عدم کے ظلمت کدے میں سہما
ہوا ہیولیٰ۔
اسی ہیولے پہ رحم کھاؤ
چراغ فردا کو مت بجھاؤ
سحر کے تارو
مجھے نہ مارو

(احسن اعرافی)

اس دور میں آزاد نظموں نے جلا پائی۔عصری حسیت ان نظموں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔خصوصاً تقسیم ہند اور فسادات کے المیے پر بڑے پیمانے پر نظمیں لکھی گئیں۔لیکن اس دور میں اردو نظم نگاری کے میدان میں کوئی ہیئتی تجربہ یا موضوعات کی سطح پر کوئی تنوع پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ رہی کہ یہ عہد ایک طرح سے نفسا نفسی کے عالم سے عبارت ہے۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ، آگ زنی، عصمت دری اور قتل و خون کا بازار گرم تھا۔ایسے میں شعرا کا احساس بری طرح مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔وہ جو کچھ دیکھتے ، جو کچھ سوچتے تھے یہی قتل وخون نظر آتا ہے۔اپنے عہد کے حالات سے وہ چشم پوشی بھی نہیں کر سکتے تھے۔تاہم ان نظموں میں فنی خوبیاں اور خصوصیات بھرپور انداز میں پائی جاتی ہیں۔شعرا نے خون دل میں قلم کو ڈبو لیا تھا۔ جو کچھ انہوں نے لکھا دل سے لکھا۔ انکی آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا اسے شدت سے محسوس کیا اور اس اذیت کے ذہنی طور پر وہ خود شکار تھے۔ایسے میں نظم نگار شعرا انہی موضوعات میں الجھے رہے اور دوسری جانب توجہ نہیں دے سکے۔لیکن اس کے فورا بعد جب زندگی نے کچھ سکون حاصل کیا۔ ملک کے سیاسی اور سماجی حالات بہتر ہوئے۔انسان کچھ اپنے اور کچھ اپنے سماج کے بارے میں سوچنے کے قابل ہوا تو اس جانب شعرا نے توجہ دی۔اور اردو نظم کی ہیئت میں تنوع پیدا ہوا۔تجربے کئے گئے۔نئی راہ نکالی گئی۔یہ سب کچھ ۱۹۵۰ء کے بعد شروع ہوا۔اسی مقام پر ترقی پسند تحریک کا دور ختم ہوا اور اس کی جگہ ایک نئی تحریک یا رجحان نے جنم لیا جسے جدیدیت کے نام سے موسوم کیا گیا۔البتہ کچھ لوگ اسے ۱۹۶۰ء کے بعد تسلیم کرتے ہیں۔بعض ۱۹۵۵ء تک ترقی پسند تحریک کا عہد تصور کرتے ہیں۔ بہر حال اسی عہد میں جدیدیت نے جنم لیا۔اور ایک نئے رجحان کے تحت شاعری کا آغاز ہوا۔جس میں زندگی کی پیچیدگی اور ژولیدگی کو شامل کیا گیا۔اس کے ساتھ ہی ہیئت اور اسلوب میں بھی تجربے کئے گئے۔اسلوب و انداز بدل گیا۔نظم کے لہجے اور مزاج میں بھی تبدیلی آئی۔ یہ تبدیلی اس قدر واضح تھی کہ اسے صاف طور پر محسوس کیا گیا۔اسی عہد میں معریٰ، آزاد اور نثری نظم نگاری کا چلن عام ہوا۔راشد اور میراجی کے ساتھ علی سردار جعفری، آزاد نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔اور آزاد نظم کی بنیاد اتنی مستحکم ہوگئی کہ آج بھی جبکہ غزل ایک بار پھر اپنے دور عروج پر ہے، آزاد نظمیں بھی بڑے پیمانے پر لکھی جارہی ہیں اور اچھی نظمیں بھی کہی جارہی ہیں۔آزادی کے بعد شاعری پر جو جمود طاری ہوا تھا وہ ٹوٹ چکا تھا اور شعرا آزادانہ طور پر سوچ رہے تھے اور اپنی مرضی کے مطابق نظمیں کہہ رہے تھے۔اسی کی بدولت موضوعات میں تنوع پیدا ہونے کے ساتھ ہیئت میں تجربے ہوئے۔ترقی پسندی کا لہجہ بھی تبدیل ہوا۔شعرا نے خطیبانہ انداز چھوڑ کر ایک سلجھا ہوا اور نکھرا ہوا انداز اختیار کیا جو نظم کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ان کے لہجے میں خود کلامی، داخلی تجربے، نجی علائم، ڈرامائی عنصر اور روایتی استعاروں میں معانی کی توسیع کا میلان نظر آتا ہے۔مگر اس کے باوجود اس عہد میں نظم کی مشترکہ خصوصیات بھی رہی ہیں۔معروف ادیب وحید اختر اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نظم گو شعرا کی وہ پوری نسل جو ۵۰ء اور ۶۰ء کے درمیان منظر عام پر آئی اپنے مزاج، لہجے اور موضوعات کے اختلاف کے باوجود کچھ مشترکہ خصوصیات رکھتی ہیں۔

ان میں سے اکثر کی ادبی تربیت انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر سایہ ہوئی۔اس لئے ان کے سیاسی، سماجی رویے پر ترقی پسندی کے وسیع تر عمرانیاتی مفہوم کو منطبق کیا جاسکتا ہے۔نظریاتی طور پر ان کی اکثریت بائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کی ہمدرد ہے۔مگر ادب میں انہوں نے ترقی پسندی کے محدود اور جامد اصولوں کے میکانکی اطلاق کے خلاف بغاوت کی۔ یہ ادب میں ادب کی اقدار کو سیاسی اور سماجی نظریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ترقی پسندی سے ان کے انحراف کا نقطہ آغاز یہی ہے۔انہوں نے نظریاتی جبر کے برخلاف اپنے ذاتی تجربات کو شعر کا حاصل بنایا۔''

اردو نظم نگاری کے اس دور کے بعد یعنی ۱۹۶۰ء کے بعد جو شاعری ہمارے سامنے آتی ہے وہ پورے طور پر جدیدیت سے عبارت ہے۔اس عہد کا شاعر اپنے آس پاس کی دنیا میں رہ کر سوچتا ہے۔اور مایوس کن کیفیات پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔جدیدیت نے احساس تنہائی، پیدا کی۔ترقی پسندی کی طرح اس میں چاند کو روٹی دیکھنے کا جذبہ نہیں تھا اور نہ ہی ان کے سامنے مزدور، مزدور کی زندگی، ان کے حقوق اور حصول آزادی مطمح نظر تھا۔وہ انسانی زندگی کو ہمدردانہ طور پر دیکھ رہے تھے جس میں زندگی صرف زندگی تھی۔

اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے فضیل جعفری لکھتے ہیں:

''..... ۶۰ء کے بعد جو غالب شعری رجحان سامنے آیا اس کا رنگ و آہنگ نیا اور فوری پیش رووں کی شاعری سے مختلف تھا۔ یہ رجحان ایک

طرح کی بے ترتیبی، مایوس کن کیفیات، ذہنی انتشار، نیز آس پاس کی دنیا اور ماحول کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے ذاتی ردعمل کا اظہار کرنے سے عبارت تھا۔ وہ انسانی اقدار جواب بھی روایتی تعلیم یافتہ طبقے کو عزیز تھیں اور وہ یوٹوپیائی مستقبل جس کی حفاظت کی ذمہ داری ترقی پسندوں نے اپنے سر لے رکھی تھی نئے شاعروں کے نزدیک شکست سے دوچار ہوکر بے معنی ہو چکا تھا۔ اب اس کی حیثیت ماضی کے بھوت سے زیادہ نہیں تھی۔ ان شاعروں کو یہ احساس بھی بری طرح ستا رہا تھا کہ بے رحم اور وحشیانہ قوتیں معاشرے اور ماحول کو ہی نہیں انسانی ذہن کو بھی تباہ و برباد کرنے کے درپے تھیں۔.....''

گویا اس دور کے شاعروں میں عصری آگہی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات میں غوطہ لگانے کا رجحان عام ہوا۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ آزادی ملنے کے بعد جس طرح مروجہ و مصدقہ انسانی اقدار کو پامال کیا گیا اس کے اثرات نئے شاعروں کے ذہن پر مرتسم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نیا شاعر اس صورت میں خود کو محصور و مقید پاتا ہے۔ یہ صورت حال کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ اس سے خود کو الگ تھلگ کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے نجات بھی نئے شاعر کے لیے ممکن نہیں تھی۔ وہ اپنے معاشرے اور سماج کی بے اعتدالیوں، برائیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی معاشرے کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرتا۔ ایسے میں وہ اپنی ذات کے اندر غوطے لگاتا ہے۔ اور ان حقیقتوں و دریافت کرتا ہے جو اندرون میں کہیں روپوش ہیں۔ احساسِ شکست اور محرومی نے اپنی شخصیت کی توانائی کو سمجھنے اور بروئے کار لانے پر مجبور کیا۔ نتیجے کے طور پر جدید نظم نگاری ذاتی اور اجتماعی دونوں محسوسات سے عبارت ہے۔ اس کے باوجود جدید نظم نگاری میں کوئی بڑی شاعری نہیں ہوئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس دور میں آزاد نظمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس دور کو تاریخ میں ایک مستقبل باب کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ نیا شاعر شہروں سے تعلق رکھتا ہے اور شہروں کی بات کرتا ہے۔ بلراج کومل اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو کا نیا شاعر شہروں کی پیداوار ہے۔ اس کی زندگی کا دارومدار شہروں پر ہے۔ اس کے محدود قارئین بھی شہروں کے باسی ہیں۔ اس لئے میں پر زور خواہش کے مطابق اس سے قطعاً یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ہندستانی کلچر یا تہذیب کا کوئی ہمہ گیر شعری اظہار پیش کر سکے اور ٹھیک یہی بات میں ان تمام شاعروں کے بارے میں کہہ سکتا ہوں جو متوازی اور مساوی حالات میں شعر کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چاہے وہ دوسری زبانوں کے شاعر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس تلخ حقیقت سے مفر ممکن نہیں۔ ہماری بحث اس حقیقت کو نظر انداز کر کے صرف غلط نتائج تک پہنچ سکتی ہے۔''

جدید نظم نگاری میں موضوعات کی سطح پر غزل کی طرح مایوسی، احساس کمتری، خود اذیتی اور لذت کوشی وغیرہ بھی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں بلراج کومل بڑے واضح انداز میں لکھتے ہیں:

''تنہائی، مایوسی، احساس کمتری، خودکشی کی خواہش، احساس کلبیت، قنوطیت، خود اذیتی، لذت کشی، ذاتی وابستگی، گھر آنگن کو واپسی، ماورائیت، شخصیت اور روح کی گہرائیوں کو ناپنے کی خواہش، زندگی کا کرب آمیز احساس (سیاہ و سپید کی بحث سے قطع نظر) یہ سب نئی نظموں کے موضوع ہیں۔ اور اسلوب میں غیر منطقی ترتیب اور خط منحنی کی طرف واضح جھکاؤ ہے۔ موضوعات کا دائرہ وسیع کرنا غیر شاعرانہ مضامین کو شاعری کی لذت سے متعارف کرانا اور الفاظ کو لغوی معنی کی سطح سے اوپر اٹھانا جدید شاعری کی بہت سی کامیابیوں میں سے چند قابل ذکر کامیابیاں ہیں۔''

جدید نظم میں علامت پسندی اور اسلوب میں انفرادیت بھی پائی جاتی ہے۔ جدید نظم نگار شعرا نے جنسیت پر بھی دل کھول کر لکھا ہے۔ طوالت سے گریز کرتے ہوئے میں دو تین اقتباسات دینے پر اکتفا کروں گا۔ معروف نقاد وہاب اشرفی علامت نگاری اور علامت پسندی میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علامت پسندی اور چیز ہے اور علامت نگاری دوسری چیز ہے۔ اور جدید نظم میں علامت نگاری نہیں پائی جاتی۔ ان کے مطابق:

''.....مشکل پسندی اور چیز ہے اور علامت نگاری اور، ہمارے زیادہ تر نظم گو شعرا جنہیں علامت نگار کہہ دیا جاتا ہے مشکل پسند ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ علامت پسند ہیں، علامت نگار نہیں۔ علامت نگاری علامت پسندی سے کوسوں دور ہے۔''

اسی مضمون میں وہ آگے لکھتے ہیں:

''.....ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا فرانسیسی علامت نگاری سے متاثر اور علامت نگار کوئی شاعر اردو میں ہے کہ نہیں، جواب نفی میں ہونا چاہئے لیکن ایک استثنائی صورت ہے۔ 'گنج سوختہ' کا شاعر۔

جدید اردو نظم میں جنسیت بھی عام رہی ہے۔ اس عمومیت کا یہ حال ہے کہ شاعرات بھی اس پر کھل کر لکھنے لگی ہیں۔ میں یہاں اس ضمن میں ایک دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ فہمیدہ

ریاض ایک معروف شاعرہ ہیں۔ ان کی نظم ''ابد'' ملاحظہ فرمائیں:

یہ کیسی لذت ہے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیف کیا ہے کہ سانس رک رک کے آ رہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسے شہوت بھرے اندھیرے اتر رہے ہیں
یہ آبنوسی بدن یہ بازو کشادہ سینہ
مرے لہو میں سمٹتا سیال ایک نقطے پر آ گیا ہے
مری نسیں آنے والے لمحے کے دھیان سے کھنچ کے رہ گئی ہیں
بس اب تو سر کا دورخ پہ چادر
دیے بجھا دو۔

دوسری طرف آشفتہ چنگیزی کی یہ نظم ملاحظہ ہو

ساتھ میں سوئی ہوئی ناکام عورت
روز اک تازہ غزل کہنے کی عادت
ایک ادّھا
اک بدن، کچھ اور سگرٹیں
روندی ہوئی پھولوں کی چادر
سلوٹیں!
کچھ دنوں سے بس یہی معمول ہے
طوطی نہیں ہے، دھول ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جدید نظم نگاری میں جہاں مختلف موضوعات کا احاطہ کیا جا رہا ہے وہیں اسلوبیاتی سطح پر نئے انداز و آہنگ اختیار کیئے جا رہے ہیں۔ اس عہد میں خصوصیت کے ساتھ آزاد اور نثری نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ پابند نظمیں لکھنے والے شعرا برائے نام نظر آتے ہیں۔

اس عہد کے معروف نظم نگار شعرا میں اختر الایمان، میرا جی، منیر نیازی، عذرا پروین، بشریٰ شعریٰ، منیب الرحمن، انیس ناگی، سلیم الرحمن، محمد علوی، مظہر امام، وحید اختر، زاہد ڈار، کمار پاشی، محمود ایاز، ساقی فاروقی، قاضی سلیم، اور عادل منصوری، مخمور سعیدی، ندا فاضلی، زبیر رضوی، شہریار، مدحت الاختر وغیرہ خاص ہیں۔ ان کے بعد اردو نظم نگاری تقریباً اسی سمت و رفتار سے جاری ہے۔

اردو نظم کے ارتقا میں عظیم آباد میں کے شعرا کا بھی بڑا حصہ ہے اور آج بھی شعرا نظمیں کہنے کی طرف راجع ہیں اور اچھی نظمیں کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ عام رجحان کے تحت بہار میں بھی آزاد نظمیں زیادہ کہی جا رہی ہیں تاہم ایک ادبی مرکز کی حیثیت سے عظیم آباد اپنی روایت کو آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ بہار میں اردو نظم نگاری کی ابتدا تقریباً اسی عہد سے ہوتی ہے جس عہد سے دہلی میں نظمیں کہنے کا آغاز ہوا۔ اس کے اولین نقوش ہمیں رکن الدین عشق، آیت اللہ جوہری، محبوب عالم عاصی، غلام جیلانی محزوں اشرف علی فغاں، مغنی غلام مخدوم ثروت اور شیخ غلام یحی حضور عظیم آبادی کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ بعد میں یہ روایت دراز ہو کر ہنوز جاری ہے۔ چند اہم نظم نگار شعرا میں قدیم دور میں شیخ محمد روشن جوشش، شاہ ابوالحسن فرد، مرزا محمد علی فدوی، شاہ نور الحق تپاں، غلام علی راسخ، ترقی، ظہور الحق ظہور، صفیر بلگرامی، صوفی منیری، شاد عظیم آبادی، شوق نیموی، امداد امام اثر، احقر بہاری، نصیر، بیتا، منیر پھلواروی، فضل حق

آزاد، عبدالغفور شہباز، فہیم الدین احمد فہیم، عظیم الدین احمد عظیم، سریر کابری، بسمل سنہاروی، عبدالماجد اختر، عبدالمنان بیدل، مسلم عظیم آبادی، ولی کاکوی، خلش گیاوی وغیرہ اور بعد کے دور میں جمیل مظہری، عبدالمجید شمس، اجتبی رضوی، عطا کاکوی، پرویز شاہدی، رضا نقوی واہی، اختر قادری، رمز عظیم آبادی، حسن عظیم آبادی اور جدید دور میں کلیم عاجز، احمد عظیم آبادی، ظفر حمیدی، صابر کریمی، منظر شہاب، فرحت قادری، سہیل واسطی، شہزاد معصومی، انیس امام، وہاب دانش، ارشد کاکوی، مظہر امام، علقمہ شبلی، حسن آرزو، شعیب راہی، صابر آروی، شمس بمن گرامی، شاہد احمد شعیب، مرتضی رضوی، اویس احمد دوراں، شفیع مشہدی، ظہیر صدیقی، مختار احمد عاصی، ظہیر غازی پوری، محبوب انور، سید احمد شمیم، صبا نقوی، ناز قادری، شکیب ایاز، علیم اللہ حالی، لطف الرحمن، سلطان اختر، شاکر کریمی، اختر یوسف، نسیم مظفر پوری، اسلم آزاد شاہد کلیم وغیرہ اہم ہیں۔ عظیم آباد نے نظم نگاری میں ہر عہد میں روایت کی پاسداری کی ہے اور فکر وفن کی شمعیں روشن کی ہیں۔